عطار ہو ،رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ھاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاھی !!

اِدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماھنامہ

شوال ۱۴۲۸ھ/اکتوبر ۲۰۰۷ء

زیر سرپرستی: مولانا پروفیسر ڈاکٹر سید سعید اللہ دامت برکاتہم

بانی: ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ (خلیفہ مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ)

مجلس مشاورت: حاجی شیر حسن صاحب، مفتی آفتاب عالم مولانا محمد امین دوست، بشیر احمد طارق، قاضی فضل واحد، مولانا طارق علی شاہ بخاری

مدیر مسئول: ثاقب علی خان

مجلسِ ادارت: ڈاکٹر محمد طارق، محمد الطاف حسین، حافظ عماد الحق، ظہور الٰہی فاروقی

RegNo.P476

جلد:ششم

شمارہ: 2

فہرست

عنوان	صاحبِ مضمون	صفحہ نمبر
۱۔نماز	حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ	۳
۲۔ سانچ کو آنچ نہیں	ڈاکٹر فدا محمد صاحب	۱۰
۳۔صبر کی حقیقت اور فضیلت	مفتی آفتاب عالم صاحب	۱۶
۴۔دلائلِ شرعیہ	حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ	۱۸
۵۔سبق آموز	ڈاکٹر سید ناصر شاہ صاحب	۲۲
۶۔حالتِ نزع	ڈاکٹر فہیم شاہ صاحب	۲۴
۷۔ اکابر علمائے دیوبند کی تواضع (اٹھارہویں قسط)	مفتی فدا محمد صاحب	۲۷

فی شمارہ:　　-/15 روپے

سالانہ بدل اشتراک:　　-/180روپے

ملنے کا پتہ:　　پوسٹ آفس بکس نمبر 1015، یونیورسٹی کیمپس، پشاور۔

ای-میل:<<< mahanama_ghazali@yahoo.com

saqipak99@gmail.com

physiologist72@yahoo.com

ویب سائٹ:　　www.iaa.org.pk

نماز

(حضرت مولانا اشرف صاحب سلیمانیؒ)

نماز مومن کا معراج اور بقولِ حضرت مجدد سرہندیؒ اس عالم میں قربِ الٰہی کا انتہائی مقام ہے۔ مومن کی زندگی جس قدر نماز سے متاثر ہوتی ہے کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتی۔ کہ کمالِ عبدیت اور خصائلِ عبودیت نماز کی با قاعدہ اور صحیح بجا آوری سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ کہ عبدیت کا حاصل خواہشِ نفس کو دبا کر ہر حال میں احکامِ الٰہی کی بحسن اخلاص تعمیل و تکمیل ہے۔ نماز میں بندہ اپنی مرضیات و خواہشات کو مٹا کر ظاہراً و باطناً، قولاً و عملاً اوامرِ الٰہیہ کی پابندی کرتا ہے۔ کبھی رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنے آقا کے سامنے ہاتھ باندھے اس کی پسند کے کلمات پڑھتا ہے اور اس کی کبریائی و صمدیت اور عظمت و جبروت اور اپنی نیستی و پستی، کم مائیگی و ہیچمیرزی کا اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اس حُسنِ ازل کے سامنے جھک کر بندگی کا ثبوت دیتا ہے اور کبھی بارگاہ جلال میں اپنی بلند پیشانی کو نیازمندی کی خاک سے عزت بخشتا ہے۔ جو پروردگار کا حکم ہوتا ہے وہی کرتا ہے۔ جو اس کی مرضی ہوتی ہے وہی کہتا ہے۔ نماز وہ عبادت ہے جس میں انسان کا دل و دماغ، جسد و روح، ظاہر و باطن بیک وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کی بندگی، اس کے احکام کی تابعداری، اس کے دھیان اور اس کی رضا کے حصول کی کوشش میں مشغول ہوتا ہے۔ نماز کی اس پابندی و ممارست سے بندہ جب بار بار اپنی خواہشات اور مرضیات کو مٹا کر اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو راہِ عبدیت کا وہ سنگ گراں جسے 'ہویٰ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان پیہم ضربتوں سے چور ہوجاتا ہے اور انسان انتہائے عبدیت یعنی رضائے مولیٰ سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔ کسی عارف کا قول ہے:۔

"اللہ اور بندے میں ایک قدم کا بُعد ہے۔ اگر ایک پاؤں اپنی خواہش (ہویٰ) پر رکھو گے تو دوسرا قدم منزل پر ہوگا۔"

قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى.

ترجمہ: جو شخص اپنے ربّ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو (حرام) خواہشوں سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔

غرض نماز کی صحیح ادائیگی ترکِ ہویٰ کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسان اپنے نفس پر قابو پا کر احکامِ الٰہیہ پر آسانی سے گامزن ہو جاتا ہے اور اس کے عبدیت وعبودیت کے کمالات وخصائل سے بہرہ وافر پالیتا ہے۔ بلکہ بعض خاصانِ خدا کا قول ہے کہ ”نماز مومن کی زندگی کا آئینہ ہے۔“ جس قدر نماز کامل ہوگی اسی قدر زندگی عبدیت کاملہ کے رنگ میں دوبی ہوئی ہوگی۔ نماز کا ظاہر و باطن پوری زندگی کے ظاہر و باطن کی عکاسی کرتا ہے۔ نماز میں جن پر خشوع طاری ہوتا ہے وہ ہر عمل میں خاشع ہوتے ہیں۔ نماز کی جھکی ہوئی آنکھیں محارم کو بھی دیکھ کر جھک جاتی ہیں۔ لغو باتوں سے بے توجہی ان ہی کانوں کو نصیب ہوگی جو عالم کے ہنگاموں سے کان بند کر کے مناجات (نماز) میں سراپا گوش ہوتے ہیں۔ جن کے دل ذاتِ حق میں نماز کی حالت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ مجمع میں بھی اس کی جانب متوجہ رہ کر ”باہمہ بے ہمہ“ (سب کیساتھ اور کسی کیساتھ نہیں) کا منظر پیش کرتے ہیں۔ نماز کا یہ عظیم عمل مومن کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے:

” الصلوة مكيالٌ فمن اوفٰى اُوفى به ومن طفف فقد علمتم ما للمطففين .“

کنز العمال

ترجمہ: نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا، اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمھیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

حضرت سید الملتہ رحمتہ اللہ علیہ اس اثر کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

”اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اس سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔“

ہم نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ مومن کی پوری زندگی ”صفتِ صلوة“ پر گذرتی ہے، اور اس میں اسی عبدیت وعبودیت، اسی امتثالِ اوامر واحکام، اسی اجتماع اور اتباعِ امیر، اسی خشوع وخضوع اسی تعلق

مع اللہ اور قربتِ حق اور اسی احسان و حضور، توبہ و انابت، تبتل و دعاء کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو نماز کا خاصہ ہے۔ اس لیے تکمیلِ صلوٰۃ تکمیلِ مومن کا سب سے بڑا زینہ ہے۔ اس لیے نماز کو نماز بنانے کی جتنی سعی کی جائے گی، اتنی ہی زندگی ایمان و تقویٰ کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

اس لیے حضرت سیدی رحمتہ اللہ علیہ نماز کی اہمیت اور اس کی تکمیل و تحسین کی طرف پیہم متوجہ فرماتے رہتے ہیں۔ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ارقام فرماتے ہیں:

''اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو، اگر اس کی بھی قدرت نہیں تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو، اگر سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو، سخت خوف کی حالت میں اگر سواری پر ہو تو جس طرف موقع ہو اسی رخ پڑھو۔''

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمٰن و رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار۔ یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے۔ یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بیقرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے۔ یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور زندگی کا خلاصہ ہے۔''

انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے، اندرونِ دل سے عرض و نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو سامنے پیش کرے۔ غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوشِ جنون کا علاج ممکن نہیں۔ وحشی سے وحشی مذہب میں بھی

عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لیے موجود ہیں۔ پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہوسکتے ہیں۔" دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں؛

"یہ (نماز) اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش وحواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک میں سو سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی و کاہلی نفاق کی علامت اور اس کا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستانِ قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نماز دین کا ستون ہے۔" جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، اس طرح نماز کے ترک کر دینے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: "نماز دل کی روشنی ہے۔" اپنی نسبت فرمایا: "نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔" ایک تمثیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بُجھ جاتی ہے۔ یہ محبوبِ ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز آبِ زلال ہے جو آگ کو سرد کر دیتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کفر و ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی ہے۔" کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار اسکے اعمال ہی سے ہوسکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے۔ عین اس وقت جب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخیر لمحے تھے اور فرض نبوی کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے، "نماز اور غلام۔"

حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نماز کی روحانی غرض و غایت کے بارے میں لکھتے ہیں؛

''نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے اس کا خالقِ کل، رازقِ عالم، مالک الملک، منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل وزبان (اور جوارح) سے ادا کریں تا کہ نفس وروح اور دل ودماغ پر اس کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی وبے چارگی کا نقش بیٹھ جائے۔اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے۔اس کے حاضر وناظر ہونے کا تصور نا قابلِ زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ ونیت اور ہر جسمانی فعل وعمل کے وقت اس ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں۔جس سے اپنے بُرے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں،اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں۔''

صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر نماز کی حقیقت پوچھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی پھر پوچھا۔یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! احسان کیا ہے؟ فرمایا'' یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو،تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔'' اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ'' نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیونکہ اس وقت وہ اپنے ربّ کے ساتھ راز ونیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔''

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا'' لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے ربّ سے سرگوشی کرتا ہے،اس کو چاہیے کہ وہ کیا عرض و معروض کررہا ہے۔نماز میں ایک دوسرے کی آواز مت دباؤ۔

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل ودماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں،اور اس کے اخلاق وعادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔اس لئے قرآن

پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی؛

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ . (عنکبوت۔۵)

ترجمہ؛اور نماز کھڑی کیا کرو کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں۔بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے،یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے۔جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے۔چنانچہ فرمایا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی . (اعلیٰ۔)

ترجمہ: کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا۔پس نماز پڑھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے۔اس سے زیادہ واضح یہ آیتِ پاک ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَ مَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ ط وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (فاطر:۳)

ترجمہ:تو ان ہی کو ہشیار کر سکتا ہے۔جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں۔اور جو تزکیہ (اور دل کی صفائی) حاصل کرتا ہے ،وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے۔اور (آخر)خدا ہی کے پاس لوٹ جانا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی ،نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔فرمایا؛

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعاً وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعاً وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعاً اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَا تِهِمْ دَائِمُوْنَ ٥ (المعارج۔۱)

ترجمہ: بے شک انسان بے صبرا بنا ہے۔ جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب دولت ملے تو بخیل، لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لیے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کا اصل سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب وشرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز سے مقصد دل کے خضوع وخشوع، توبہ وانابت، پشیمانی وشرمندگی، اطاعت وبندگی اور خدا کی عظمت اور کبریائی اور اپنی عاجزی ودرماندگی کا اظہار، نیز دل ودماغ اور نفس وروح میں پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے۔اس بنا پر نماز کے لیے بھی ایسے آداب وشرائط اور ارکان مقرر کیے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو ونما ہو مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے۔ ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچے کیئے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات میں آدب واحترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، آدب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے۔اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں باطنی فیوض وبرکات کی استعداد وصلاحیت پیدا ہوتی ہے۔فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی اور پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی اور پاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام وارادہ میں جاری وساری ہے، اندر کے بنانے کے لیے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

سانچ کو آنچ نہیں

(ڈاکٹر فدا محمد صاحب دامت برکاتہٗ)

یہ اردو کا ایک محاورہ ہے۔ سانچ سچ کے لئے ہے، ہر زبان کے بولنے والے مختلف علاقوں میں الفاظ کو مختلف طریقوں سے بولتے ہیں۔ چنانچہ کسی علاقے میں سانچ کہتے ہونگے۔ آنچ آگ کو کہتے ہیں۔ گویا محاورے کا مطلب ہے کہ سچ کو کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہے۔ الصدق ینجی والکذب یھلک یعنی سچ نجات دیتا ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے سارے نظاموں کو سچ چلا رہا ہے جبکہ جھوٹ ہر نظام کو نقصان پہنچانے اور توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظام تب ہی چلتا ہے جب جھوٹ سے بچ بچاؤ کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ خیال ہوا کہ اس اصول کے بارے میں اپنی زندگی میں جو اپنے تجربے اور ساتھیوں کے تجربے سامنے آئے اور جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا یا اُن کو کرتے دیکھا، اس کو لکھ لیا جائے تو عبرت حاصل کرنے کے لئے اور نصیحت قبول کرنے کے لئے اچھا سامان ہو جائے گا۔

بندہ کو جن بزرگوں کی صحبت حاصل ہوئی ان میں حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ دہلوی تبلیغی جماعت کے امیر تھے، بندہ کے شیخِ اول تھے کیونکہ بندہ نے ۱۹۶۹ء میں پہلی بیعت انہیں سے کی تھی۔ تبلیغی دورے کے لئے ملائیشیا یا انڈونیشیا کا سفر فرما رہے تھے، سرحد پر داخلے کے وقت عملے نے پوچھا کہ آپ کے پاس پیسے کرنسی وغیرہ تو نہیں ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں ہے۔ آگے جانے کے بعد اچانک جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ نکل آیا۔ انتہائی پریشان ہوئے اور خوب توبہ اور استغفار کی کہ جیب میں ایک روپیہ تھا اور میں نے کہہ دیا کہ نہیں ہے۔

ع　　　مقبلاں را بیش بود حیرانی

ترجمہ: مقبول بندوں کو بہت فکر ہوا کرتی ہے۔

ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا محمد عمر پالن پوری صاحبؒ نے اپنے بیان میں ایک واقعہ سنایا کہ ہندوستان میں ایک بیل گاڑی والے نے بستی نظام الدین (ہندوستان کا تبلیغی مرکز) آکر جماعت میں چلہ گزارا۔ آدمی سیدھا سادہ تھا۔ صحیح یقین، توحید، اتباع سنت، سچ، انصاف اور دیانتداری کے اصول سیکھ لئے اور عملی زندگی میں برتنے لگا۔ ایک دن اچانک ایک بچہ اس کی بیل گاڑی کے نیچے آکر مر گیا۔ بچے کو خود اٹھا کر اور تھانے پہنچا کر اپنی گرفتاری کروالی اور سچ سچ بیان دے دیا۔ برادری کو پتہ چلا انہوں نے وکیل لیا۔ وکیل صاحب نے آکر اس گاڑی بان کو بیان سمجھایا لیکن اس سیدھے سادھے آدمی نے آگے سے کہا کہ وکیل صاحب اُس وقت آپ موجود نہیں تھے میں خود موجود تھا۔ لہٰذا بیان یہ ہے۔ وکیل صاحب کو اندازہ ہوا کہ سادہ لوح آدمی وکیل کی سمجھداری کی بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ غرض اس مقدمے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس نے از اول تا آخر بالکل بیان نہیں بدلا۔ مقدمے کی کاروائی مکمل ہوئی، جج صاحب نے فیصلہ سنایا کہ اتنا دیانتدار، راست باز اور سچا آدمی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ بجائے اسے سزا دینے کے اسے معاشرے میں رکھا جائے تاکہ معاشرے میں شانتی (امن) اور سدھار (اصلاح) آئے۔

واقعی سچائی اور دیانتداری تو انسانی صفات ہیں۔ مسلمان نے تو ان کی قدر کرنی ہی ہے کہ اس کے لئے آخرت کا سرمایہ، اللہ کی رضا اور نجات کا سامان ہیں۔ لیکن کافر، ہندو بھی اس کی قدر کرتا ہے کیونکہ معاشرے میں اطمینان، اصلاح اور سدھار اس کی وجہ سے ہی ہے۔ اس طرح اُس گاڑی بان کو وکالت کے دلائل کی جگہ سچ کی حقیقت کام آئی اور نجات کا سامان بنی۔

بندہ کی ایک مجلس ذکر حیات آباد میں ہوتی ہے۔ اس میں کچھ نوجوان دوست شامل ہوتے تھے۔ ایک دن ایک برخوردار، جو ایک ریٹائرڈ میجر کے بیٹے تھے اور مجلس میں آتے تھے، پریشان آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا چھوٹا بھائی ہے جس نے چار ماہ تبلیغی جماعت میں لگائے ہیں، روسیوں کے خلاف افغان جہاد میں بھی لڑا ہے، کسی مدرسے کا طالب علم بھی تھا، گھر آیا ہوا تھا

کہ کچھ لڑکوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ انہوں نے اسے کہا کہ یہاں ایک رشوتی افسر ہے، عقیدہ بھی اس کا خراب ہے، رات اس کے گھر پر حملہ کرتے ہیں ۔ جہاد بھی ہو جائے گا اور مال غنیمت بھی ہاتھ آجائے گا۔ واہ رے واہ جہاد اور مالِ غنیمت جس کا فیصلہ کبھی مسلمانوں کے خلیفۂ وقت کیا کرتے تھے۔ نوجوان نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ کسی اہلِ علم بڑے بوڑھے سے مشورہ بھی نہیں کیا۔

حملہ کے لئے گئے، آدمی کا چوکیدار جاگ گیا۔ اس نے فائرنگ کی ، باقی مجاہد تو فوراً بھاگ گئے اور یہ اصلی مجاہد ڈٹا رہا۔ اس کو ایک گولی ہاتھ میں لگی ایک پاؤں میں ۔ آخر اس نے آواز دی انکل اور فائر نہ کریں میرے پاس کچھ نہیں ۔ فائر بند ہوا لڑکا گرفتار ہوا۔

ہم مجلس والوں کو بہت افسوس ہوا۔ مجلس کے بیان اور ذکر کے بعد بڑی فکر سے دعا ہوئی ۔ بندہ نے ملزم کے بڑے بھائی سے کہا کہ برخوردار اُس سے کہیں کہ سچ سچ بیان دے دے، اللہ کی ذات سے خیر کی امید کرتے ہیں ۔ مجلس کے ساتھیوں نے کہا کہ مجلس کی دعا کے بعد ہمارے دل گواہی دے رہے تھے کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

خیر برادری والوں نے مقدمے کے لئے وکیل لیا۔ وکیل نے برخوردار کو بیان سمجھایا کہ یوں کہے کہ پہلا بیان پولیس کے دباؤ کے تحت دیا ہے۔ اصل بیان یہ ہے کہ آدھی رات کے بعد میں گھر سے نکلا، ایسے ہی واک (چہل قدمی) کر رہا تھا کہ اس اثنا میں ایک مکان سامنے آگیا دروازہ کھلا تھا کچھ شور ہو رہا تھا۔ میں صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے اندر ہوا کہ اس اثنا میں مجھے دو گولیاں لگ گئیں اور جب معلوم ہوا تو میں گرفتار تھا اور زخموں کے لئے زیرِ علاج تھا۔

بات کی جب پوری حقیقت سامنے آئی تو وہ یہ تھی کہ جس آدمی کے گھر ڈاکہ پڑا اُس کا ایک غیر ذمہ دار لوفر بھانجا تھا۔ اُس نے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا۔ ماموں نے انکار کیا۔ اس نے اس کا بدلہ لینے کے لئے یہ جہادی پارٹی تشکیل کی جس میں ایک افغانی ، یہ ملزم مجاہد صاحب اور ایک خود۔ پوری اخلاص کے ساتھ جہاد کی نیت صرف ملزم صاحب کی تھی باقی جعلی مجاہد تھے اس لئے

فوراً بھاگ گئے۔

پہلے بیان میں تو بھانجے کا نام آگیا تھا۔ بھانجے کے ماں باپ نے دوسرے بیان پر مؤقف اختیار کیا کہ ہمارے بیٹے کو ماموں مفت میں بدنام کررہا ہے۔لڑکے کے دوسرے بیان میں اس کا نام تک نہیں۔ ماموں نے ملزم سے رابطہ کیا کہ برخوردارلڑکا ہمارا بھانجا ہے ہم اس کی گرفتاری اورسزاکے حق میں نہیں ہیں لیکن کم ازکم آپ وہ سچا بیان دے کراتنا تو واضح کردیں کہ یہ جرم ہمارے بھانجے نے ہی کیا ہے۔ یہ کردیں تو ہم آپ تینوں کو چھوڑ دیں گے اور آپ کے خلاف مقدمہ نہیں کریں گے۔

ملزم برخوردار نے سہ بارہ سچا بیان دیا اور مقدمے والوں نے انہیں معاف کیا اور کیس ختم ہوا۔ بندہ کو اطلاع ملی تو بندہ نے عرض کیا کہ اللہ کا شکر ہے کہ مسئلہ سچ کے زور سے حل ہوا وکیل کے جھوٹے دلائل سے نہیں۔ چونکہ مسلح ڈکیتی کی شرعی سزا ایک ہاتھ ایک پیر کاٹنا ہے اس لئے برخوردار کے بارے میں بندہ نے کہا کہ یہ سزا اس پر قدرتی اور تکوینی امر سے نافذ ہوگئی۔ واقعی نوعمر جب کسی سمجھدار آدمی سے مشورہ کئے بغیر خود فیصلہ کرلیتے ہیں تو سخت مشکلات میں مبتلا ہونے کے حالات ہوجاتے ہیں۔

ایک واقعہ خود بندہ کے ساتھ پیش آیا۔ یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے۔ بندہ کا لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں بطور ڈاکٹر کام کرنے کا پہلا سال تھا۔ہسپتال کے پاس مسجد تھی، اس میں ہم نماز پڑھتے تھے۔اس کے امام فارغ التحصیل عالم تھے۔ایک دن انہوں نے کہا ڈاکٹر صاحب میرے ساتھی کو چار مہینوں کی میڈیکل چھٹی کا سرٹیفکیٹ دے دو۔ بندہ نے کہا کہ یہ تو جھوٹ ہوجائے گا۔انہوں نے کہا یہ جھوٹ نہیں ہے یہ ضرورت کے لئے وسیلہ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کافروں سے جان چھڑانے کے لئے اِنِّیْ سَقِیْمٌ میں بیمار ہوں کہا تھا۔ بندہ ان کی باتوں میں آگیا اور چھوٹتے ہی پورے چار مہینے کا سرٹیفکیٹ لکھ دیا۔ ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ

مسلسل چار مہینے کا سٹوفکیٹ یک بارگی نہیں دیتے۔ خیر یہ سٹوفکیٹ ہسپتال کے انچارج ایم ایس کے پاس وضاحت کے لئے آیا۔ ایم ایس نے بندہ کو بلایا اور پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ سٹوفکیٹ آپ نے دیا ہے؟ بندہ نے کہا جی ہاں میں نے دیا ہے۔ اس نے پوچھا کتنے پیسے لئے ہیں؟ میں نے کہا پیسے تو نہیں لئے۔ اس نے کہا دیکھیں آپ سیدھے سادھے آدمی ہیں یہ پیسے کسی کمپاؤنڈر نے لئے ہوں گے اور سٹوفکیٹ آپ سے بنوایا ہوگا۔ بندہ نے کہا ایسی بات نہیں ہے یہ آدمی بندہ کا واقف تھا اس لئے بنا دیا۔ اس پر ایم ایس نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ ایسا جرم ہے کہ اس پر آپ کی ڈگری ختم ہوسکتی ہے، آپ کی ملازمت ختم ہوسکتی ہے۔ خیر یہ ایم ایس سید امیر علی شاہ صاحب، بندہ کے والد صاحب کے مہربان دوست جو اہل سادات میں سے تھے، کے واقف تھے۔ انہوں نے اسے میرا خیال رکھنے کا کہا ہوا تھا۔ امیر علی شاہ صاحب نے بندہ کو نصیحت کر کے رخصت کر دیا اور کیس اپنے پاس رکھ لیا۔

بندہ نے واپس آ کر غور و فکر کیا کہ ایک کام ایک مولوی صاحب کے کہنے پر خدمتِ خلق کے لئے کیا تھا اُس پر پکڑ ہوگئی حالانکہ عمومی تجربہ تھا کہ بندہ نے جو خدمت خلق کے کام کئے اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے بہت آسانیاں اور برکتیں نصیب فرمائیں۔ بندہ کو خیال ہوا کہ اس عمل میں کوئی گڑ بڑ ضرور ہوگئی ہے جس کی وجہ سے حالات مشکل ہو گئے۔ بندہ نے معلومات اور تحقیقات کیں۔ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان کی کتاب ''گناہِ بے لذت'' میں لکھا ہوا تھا جھوٹا سٹوفکیٹ دینا جھوٹی گواہی ہے جس کا گناہ دو دفعہ بدکاری کے برابر ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ خاص طور پر اس مولوی صاحب پر جس نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کا حوالہ دے کر بندہ کو متاثر کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بعض مولوی صاحبان بہت بے احتیاط ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں تاویلات، حیلے ہی ہوتے ہیں اور باوجود استعداد نہ ہونے کے خود استنباط کرتے ہیں۔ خوفِ خدا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی غم فکر ہی نہیں۔

خیر بندہ نے سوچا خطا کا علاج استغفار ہے۔ اس لئے فوراً صلوٰۃِ توبہ پڑھی، سات روزے جرمانے کے منت کئے اور تیس روپے خیرات کئے، اس دور میں سونا تقریباً چار پانچ سو روپے تولہ تھا۔ چند دن بعد بندہ کا انٹرویو اُس ایم ایس صاحب کے ساتھ تھا اور جونیئر ہاؤس آفیسر سے سینئیر ہاؤس آفیسر کی ترقی ہونی تھی۔ استغفار کے بعد تسلی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہوگی۔ پیشی ہوئی۔ ایم ایس صاحب نے سلیکشن کمیٹی سے بندہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا یہ ڈاکٹر فدا ہے جس کی عادت جھوٹے سرٹیفکیٹ دینے کی ہے۔ ایک سرٹیفکیٹ دینے کو انہوں نے عادت کہہ دیا۔ خیر بندہ نے جس کنسلٹنٹ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کیا تھا وہ بول پڑے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایسا آدمی ہے یا وارڈ میں ہوتا ہے یا مسجد نماز کے لئے جاتا ہے، ایک دن شبِ جمعہ تبلیغی اجتماع میں جاتا ہے۔ یہ اس کے ساتھ کسی نے دھوکہ کیا ہے، یہ خود قطعاً ایسا آدمی نہیں ہے۔ دوسرا بولا تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ بادشاہ سا آدمی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ بس سب نے متفقہ سینئیر ہاؤس جاب کا فیصلہ کرلیا اور کیس بالکل رفع دفع کر دیا۔ واقعی توبہ، صدقہ اور روزہ مشکلات کے پہاڑ توڑ کر میدان ہموار کر دیتے ہیں۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

(صفحہ ۹ سے آگے) اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کر دے گا۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان ظاہر محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند شخص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں۔ ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو پُر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے۔

(جاری ہے)

صبر کی حقیقت اور فضیلت

(مفتی آفتاب عالم صاحب، مدرس دارالعلوم جامعہ فاروقیہ شاہ کس پشاور، مہتمم مدرسہ امجدیہ پشاور)

ماہِ شعبان میں محترم ڈاکٹر سیار صاحب کے جواں سال فرزند عزیر کی اچانک وفات کا حادثہ پیش آیا جو یقیناً سیار صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ کے لئے ایک المناک اور روح فرسا واقعہ تھا۔ مرحوم اپنی ہمشیرہ کے ہاں کراچی گئے ہوئے تھے۔ جہاں ریل گاڑی کی ٹکر ان کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا باعث بنی۔ اگرچہ بظاہر یہ واقعہ ناگہانی اور اتفاقی تھا لیکن خدائے علیم وخبیر ذات کے ہاں یہ پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ ایک لختِ جگر کی جدائی اور خصوصاً عنفوانِ شباب میں اچانک مفارقت بلاشبہ طبعی رنج وصدمہ کا باعث ہوتی ہے۔

یہ دنیا غم اور خوشی کے واقعات سے لبریز ہے۔ تاہم شریعت نے مسلمان کو ہر دو مواقع پر زریں ہدایات دی ہیں۔ اگر ہم ان ہدایات پر عمل پیرا ہو جائیں تو خوشی ومسرت کے مواقع پر حدود سے تجاوز نہیں ہوگا اور رنج وصدمہ کے واقعات کا اثر ہم کو ہلکا محسوس ہوگا۔

مسلمان کے لئے رنج وصدمہ اور مصائب اور مشکلات کے مواقع پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات پر کامل یقین اور تقدیر پر راضی رہنا اطمینان اور صبر کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ ہے۔ اس ضمن میں خطباتِ حکیم الامت (جلد ۹) کے مطالعہ کی روشنی میں چند سطور افادۂ عام کے لئے پیش خدمت ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسلمان کا لڑکا مرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کے جگر کا ٹکڑا چھین لیا۔ وہ کہتے ہیں ہاں خداوندا! فرماتے ہیں کہ پھر میرے بندے نے کیا کہا۔ وہ عرض کرتے ہیں خداوندا! آپ کی حمد کی اور شکر کیا اور انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بنادو اور اُس کا نام ''بیت الحمد'' رکھ دو۔ اگر پیش آنے والی مصیبت پر صبر کیا جائے تو احادیث میں اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ صبر کی حقیقت ہے جزع فزع نہ کرنا اور مستقل رہنا اور تنگی اور کراہت نہ ہونا۔

مصائب اور تکالیف کے مواقع پر انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھنے کا حکم ہے۔ چنانچہ ان کلمات میں ہم کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ یہ یقین کر لو کہ ہم سب خدا کے پاس جائیں گے اور ہم کو وہاں مصیبت کا اجر ملے گا اور جو مر گئے ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کے پاس گئے ہیں جہاں ان کو دنیا سے زیادہ راحت ہے پھر صدمہ کی کیا بات ہے۔ اس مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے تعزیت کے طور پر عرض کیا تھا جب ان کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تھا۔ کہتا ہے

ے اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَاِنَّمَا　　　صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ

ترجمہ: آپ صبر کیجئے تا کہ ہم بھی آپ کو دیکھ کر صبر کریں، کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے تابع ہے۔

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ　　　وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

یعنی آپ کے لئے وہ اجر حضرت عباسؓ کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے جو اُن کے وصال پر صبر کرنے سے آپ کو ملے گا اور حضرت عباسؓ کے لئے اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ بہتر ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ جگہ دی جو اُن کے لئے بہتر تھی اور آپ کو وہ چیز (صبر پر اجر کا ثواب) دی جو آپ کے لئے بہتر تھی پھر کس چیز کا غم۔

غرض "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" میں دو جملے ہیں ایک "اِنَّا لِلّٰه" اور دوسرا جملہ "وَ اِنَّـا اِلَيْـهِ رَاجِعُوْن"۔ پہلے جملے میں حق تعالیٰ کی مالکیت (کہ ہم اللہ کے ہیں) کو ظاہر کر کے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے۔ پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے بارے میں کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہماری مرضی کے خلاف نہ ہوگا، کیونکہ خلافِ مرضی ہونے کا مبنیٰ تجویز ہی تھی، جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلافِ مرضی نہ ہوگا۔

دوسرے جملے میں عوض ملنے کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے استحضار سے رہا سہا غم بھی ہلکا ہو جائے گا کیونکہ جس کلفت کا عوض اس سے زیادہ مل جائے اس پر رنج نہیں ہوا کرتا۔ عقلی غم تو ان دونوں مضمونوں کو پیشِ نظر کر لینے سے کبھی نہیں رہ سکتا۔ البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ سو اگرچہ طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ ہی دفعۃً زائل ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کے کم کرنے کا بھی سامان کیا ہے۔ چنانچہ "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔

دلائلِ شرعیہ

(از ’’اشرف الجواب‘‘ حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ)

دلائلِ شرعیہ چار ہیں، (۱) کتاب (۲) سنت (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔ جو امر ان دلائلِ چہار گانہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو وہ دین میں معتبر ہوگا ورنہ رَد ہے۔ پس یہ بھی غلطی ہوگی کہ ان چاروں سے تجاوز کیا جائے۔

ایک عام غلطی:

آج کل ایک عام غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلے کو قرآن شریف سے ثابت کریں، حالانکہ دلائل شریعت کے چار ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ثابت ہو جائے گا تو وہ شرعاً ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ داڑھی رکھنے کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ کہ داڑھی رکھنا فرض ہے اور یہ دلائل کا مطالبہ کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ جن کو خود تحقیق واستدلال ہی سے اصلاً مس نہیں۔ ان کو تو چاہئے تھا کہ محض تقلید کرتے علماء کی۔ قاعدۂ عقلی ہے کہ جس فن کو جو جاننے والا ہوتا ہے وہی اس میں دخل دے سکتا ہے اور نہ جاننے والا دخل دے تو اس پر سب ہنستے ہیں۔ یہ قاعدہ ہر جگہ تو جاری کرتے ہیں لیکن دین کے اندر ہر شخص مجتہد ہونے کا مدعی ہے اور ہر کس وناکس اس میں دخل دینے کے لئے تیار ہے۔ فنِ زراعت کو مثلاً میں نہیں جانتا تو اگر میں گیہوں بونے کا طریقہ بیان کروں تو جاننے والے یہ کہیں گے کہ تم کیا جانو۔ اور تم عقلاء کے نزدیک یہ جواب کافی سمجھا جائے گا مگر حیرت ہے کہ دین کے بارے میں علماء بعینہٖ یہی جواب دیتے ہیں تو ناکافی شمار ہوتا ہے۔

یاد رکھو فن کے جاننے والوں کے سامنے تمہارے مطالبۂ دلائل کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس گھڑی ہے اور وہ بڑی معتبر ہے، تار گھر سے ملی ہوئی ہے اور ایک شخص آفتاب کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑا ہے۔ گھڑی والا کہتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے آفتاب چھپ گیا ہے اور اس میں ہرگز غلطی کا احتمال نہیں۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ آفتاب میرے سامنے ہے چھپا نہیں اور گھڑی والا اس سے دلیل طلب

کرتا ہے اور وہ ہنستا ہے کہ یہ تو کھلی بات ہے، آفتاب نظر کے سامنے ہے تم اس طرف منہ کر کے دیکھو آفتاب موجود ہے، دلیل کی حاجت نہیں۔

پس جن لوگوں نے دین کے باب میں اپنی عمریں کھپا دی ہیں ان کا قول معتبر ہوگا یا ایک لڑکے کا جو آج ہی بالغ ہوا ہے لیکن دین کا بالغ نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ے خلق اطفال اند جز مستِ خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

ترجمہ: لوگ بچے ہیں سوائے ان کے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہیں اور جو خواہشِ نفس سے نہیں چھوٹا وہ بالغ نہیں۔

بہر حال حساً بالغ ہو یا نہ ہو روحاً بالغ نہیں ہے بلکہ ہم کو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے اس لئے کی ظاہری علامت بلوغ کی داڑھی تھی اور وہی صفا چٹ ہے۔ معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلی ہے یا نہیں؟

شریعت کے دلائل:

بہر حال ایسے لوگ جن کی یہ حالت کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی وہ دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک غرض مضمر (چھپا ہوا) ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم اس دعویٰ پر اول ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہے اور کوئی نہیں۔ خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں۔

حدیثِ رسول ﷺ:

فرماتے ہیں:

وَ مَا اٰتٰکُمَ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَ مَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا. (الحشر:۷)

ترجمہ: اور جو رسول اللہ ﷺ تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں ان سے رک جاؤ۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو مثلِ قرآن شریف حجت (دلیل) ہے اور کیوں نہ ہو کہ وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (کہ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے) آپ کی شان ہے۔

گفتۂ اُو گفتۂ اللّٰہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللّٰہ بود

ترجمہ: ان کا بول اللہ کا بول ہے اگرچہ وہ اللہ کے بندہ کے حلق سے نکل رہا ہے۔

اجماع:

وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْھُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصْلِهٖ جَھَنَّم (النساء:۱۱۵)

ترجمہ: اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جبکہ کھل چکی اُس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اُس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں۔

اس آیت شریف سے اجماعِ اُمت کا حجت ہونا معلوم ہوا۔

قیاس:

فرماتے ہیں:

وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْھُمْ. (النساء:۸۳)

ترجمہ: اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک تو تحقیق کرتے اس کو جو اُن میں تحقیق کرنے والے ہیں۔

اور فرماتے ہیں فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار (پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو)

یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔

پس اگر آپ قرآن شریف کو مطلق حجت مانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض دعاویٰ مسموع اور حجت اور بعض نا مسموع۔ غرض یہ سخت غلطی ہے۔ دیکھئے عدالت میں دعویٰ کی سماعت کے لئے مطلق شہادت کی ضرورت ہے۔ مدعی اگر دو با وجاہت آدمیوں کو پیش کرے تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں جج صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو میں مانوں گا۔ اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا اور یہی کہے گا کہ تم ان گواہوں پر جرح کرو تو اس کی طرف التفات ہوگا لیکن اگر یہ مجروح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک لغو بات ہوگی۔

اسی طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعویٰ کے اثبات کے لئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے۔ دلیل دینے والا جس دلیل کو چاہے اختیار کرے۔ مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے۔ اُس کا جواب بذمہ مدعی ہوگا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار کی دوسری کیوں نہ کی۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ کسی شرعی مسئلہ کے اثبات کے لئے مطلق دلیلِ صحیح کی ضرورت ہے جو دلائلِ اربعہ میں سے ہو۔ کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا لحاظ ضروری ہے کہ قطعی دعویٰ کے لئے قطعی دلیل اور ظنی دعویٰ کے لئے ظنی دلیل ہونا چاہئے جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔

غرض ایک تو غلطی یہ ہے اور دوسرے اس کے مقابلے میں یہ ہے کہ ان چاروں سے گزر کر نرے ظن کو ہی حجت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ صحیح دلیل اور دلائلِ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے۔

باعثِ نجات: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ہیں جو نجات دلانے والی ہیں، اور تین ہی چیزیں ہیں جو ہلاک کر دینے والی ہیں، پس نجات دلانے والی تین چیزیں تو یہ ہیں۔ ایک خدا کو خوف خلوت میں اور جلوت میں (یا ظاہر میں اور باطن میں) اور دوسرے حق بات کہنا خوشی میں اور غصہ میں، اور تیسرے میانہ روی خوشحالی میں اور تنگدستی میں۔ اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں۔ ا۔ وہ خواہشِ نفس جس کی پیروی کی جائے، ۲۔ وہ بُخل جس کی اطاعت کی جائے (یعنی اس کے تقاضے پر چلا جائے) اور ۳۔ آدمی کی خود پسندی کی عادت اور یہ ان سب میں زیادہ سخت ہے۔ (معارف الحدیث مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

سبق آموز

(ڈاکٹر سید ناصر شاہ، صدر شعبۂ پراستھوڈونٹکس، سردار بیگم ڈینٹل کالج، پشاور)

پہلی کہانی:

ایک بزرگ اپنے پوتے کو کہانی سنا رہا تھا کہ ''بیٹا ! انسان کے اندر دو پہلوان رہتے ہیں ان دونوں میں ہر وقت کشمکش، کشتی اور دھینگا مشتی ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایک غالب آتا ہے اور کبھی دوسرا۔ ان میں سے ایک پہلوان انسان کو سچائی، خیر خواہی، ہمدردی، صبر و شکر، عدل و انصاف اور خدمتِ خلق پر ابھارتا ہے۔ جبکہ دوسرا پہلوان انسان کو جھوٹ، فریب، ظلم و ستم، حرص، حسد، ایذائے خلق اور دشمنی پر ابھارتا ہے۔''

''دادا جان ! ان میں سے اکثر کون جیتتا ہے؟'' پوتے نے پوچھا۔

''بیٹا ! ان میں سے وہ پہلوان جیت جاتا ہے جس کو انسان غذا فراہم کرتا ہے۔'' اس کے دادا نے جواب دیا۔

پوتا نے پوچھا ''دادا جان ! ان کی غذا کیا ہے؟''

دادا نے جواب دیا کہ ''کہ جو پہلوان آدمی کو سچائی، خیر خواہی، ہمدردی، صبر و شکر، عدل و انصاف اور خدمتِ خلق پر ابھارتا ہے اُس کی غذا اعمالِ صالحہ، صحبتِ کاملین اور صالح کتابیں ہیں اور جو پہلوان آدمی کو جھوٹ، فریب، ظلم و ستم، حرص، حسد، ایذائے خلق اور دشمنی پر ابھارتا ہے اس کی غذا اعمالِ سیئہ، بری صحبت اور فحش اور لادین کتابوں کا مطالعہ ہے۔''

دوسری کہانی:

ایک بچہ اپنے والد کے ساتھ پہاڑوں کے درمیان دشوار گزار راستوں سے جا رہا تھا۔ اچانک ٹھوکر کھا کر گرا۔ زخمی ہو کر کراہنے لگا۔ سامنے کے پہاڑ سے اس کے کراہنے کی بازگشت سنائی دی۔ اس لڑکے نے آواز دے کر پوچھا، تم کون ہو؟ سامنے کے پہاڑ سے بھی آواز آئی 'تم کون ہو؟' لڑکے نے آواز دی ''بزدل جواب دو'' پہاڑ سے بھی وہی صدا آئی ''بزدل جواب دو'' ۔لڑکے نے اور اونچی آواز لگائی ''تم

احمق ہو۔'' پہاڑ سے بھی وہی آواز آئی ''تم احمق ہو۔'' اس کے والد نے کہا ''اب تم خاموش ہو جاؤ میں بات کرتا ہوں۔'' اس کے والد نے آواز لگائی ''شاباش! تم بہادر ہو'' پہاڑ سے آواز آئی ''شاباش! تم بہادر ہو''۔ لڑکے نے اپنے والد سے پوچھا ابا جان! یہ کون ہے؟ والد نے جواب دیا بیٹا! عام زبان میں اس کو بازگشت کہتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ہماری زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ اپنی زندگی میں جو چیز لاؤ گے معاشرے سے وہی جواب ملے گا۔ اگر اپنے اندر لوگوں کے لئے محبت، خیر خواہی، ہمدردی پیدا کرو گے تو لوگوں کے دلوں میں بھی آپ کے لئے محبت، خیر خواہی، ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اپنے ماتحتوں سے دیانتدارانہ کام لینے کے لئے خود ایمانداری برتو گے۔ غرض اپنے اندر جو خوبی پیدا کرو گے معاشرے سے وہی جواب پاؤ گے۔ اس کے برعکس اگر منفی رویہ اختیار کرو گے تو لوگوں کا رویہ بھی منفی پاؤ گے۔

تیسری کہانی:

دو دوست کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ دوران سفر دونوں کے درمیان کسی بات پر بحث ہو گئی۔ ایک دوست نے مشتعل ہو کر دوسرے کو تھپڑ مار دیا۔ مار کھانے والے دوست نے ریت پر لکھا ''میرے دوست نے مجھے تھپڑ مارا'' اور خاموشی سے اپنے دوست کے ساتھ آگے روانہ ہوا۔ آگے ایک پہاڑ سے گزرتے ہوئے مار کھانے والے دوست کا پاؤں پھسلا اور قریب تھا کہ گہری کھائی میں گر کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ مارنے والے دوست نے فوراً اسے سہارا دیا اور گرنے سے بچا لیا۔ گرنے والے دوست نے پتھر پر یہ الفاظ کندہ کئے ''میرے دوست نے میری زندگی بچائی۔'' بچانے والا دوست بہت حیران ہوا اور اپنے دوست سے پوچھا کہ جب میں نے تمہیں تھپڑ مارا تو تم نے ریت کے اوپر لکھا جس کو تیز ہوا کے ایک جھونکے نے مٹا دیا لیکن جب میں نے تمہاری زندگی بچائی تو تم نے اس کو پتھر کے اوپر ہمیشہ کے لئے کندہ کر دیا۔ دوست نے جواب دیا کہ ''اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو دل کے ایسے حصے پر لکھو کہ اس کو جلدی بھلا سکو اور دوسروں کے احسانات کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھو۔''

چوتھی کہانی:

مینڈکوں کا ایک غول ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ ان میں سے دو مینڈک ایک کھڈے میں جا گرے۔ باقی مینڈک کھڈے کے اردگرد جمع ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو کہنے لگے کہ چھلانگ لگانے کی ضرورت نہیں۔ تم کبھی بھی اس کھڈے سے نہیں نکل سکتے۔ آرام سے لیٹ کر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ان دو مینڈکوں نے اپنے ساتھیوں کی آواز کو توجہ نہیں دی اور چھلانگیں لگانے لگے۔ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

حالتِ نزع (بارہویں قسط)

(ڈاکٹر فہیم شاہ صاحب، ڈسٹرکٹ سپیشلسٹ کوہاٹ)

وارڈ میں ایک بیمار داخل ہوا۔ سنت کے مطابق چہرہ، سینے میں جلن اور تیز بخار کی شکایت تھی اس کو۔ ڈاکٹر راؤنڈ کرنے جاتے تو وہ ان کو پہلے سلام کرتا، پھر اپنا حال نہایت اطمینان سے بتاتا اور ساتھ کہتا اللہ کا شکر ہے پہلے سے اچھا ہوں، لیکن اس کے بخار کی کیفیت زیادہ ہوئی تھی کم نہیں ہوئی۔ تمام لیبارٹری کے ٹسٹ کسی بیماری کے متعلق رہنمائی نہ کرسکے۔ ایک دن صبح میں اس کی حالت پوچھنے گیا۔ تو وہ خاموشی سے اللہ کا ذکر کررہا تھا۔ آج اس نے میری طرف دیکھ کر سلام نہیں کیا بس خاموش تھا۔ میں نے اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا، اس کا معائنہ کرکے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر گیا۔ تو اس کا بے جان جسم تھا وہ نہیں تھا۔ اتنی تھوڑی دیر میں وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ پاس اس کا بیٹا اور دوسرے رشتہ دار تھے، مجھ سے کہنے لگے دیکھیں کہ یہ زندہ ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ تو جواباً کہا۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلا۔ صبح کی نماز کے بعد اس کی حالت تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مسکراتا تھا اور پھر خاموش ہوجاتا۔ آج صبح اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ بس اپنی تسبیح پڑھتا تھا۔ آخر میں ہماری طرف دیکھا پھر گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ڈاکٹر صاحب! نہایت اچھا آدمی تھا، لوگوں کے کام آنے والا، تبلیغ کے کام کے ساتھ منسلک بہت اچھا وقت گزارا تھا اس نے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو موت بھی اچھی دی۔ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے آمین)۔

میں ایک بیمار کو دیکھنے گیا جس کی دماغ کی رگ پھٹنے کی وجہ سے بے ہوشی طاری تھی۔ اس کا سانس اُکھڑا ہوا تھا۔ گلے سے خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں، ناک کی نالی خوراک کیلیے اور چھوٹے پیشاب کی نالی پیشاب کے لیے ڈال دی گئی۔ ایک طرف کو لِٹا دیا گیا تاکہ اس کے منہ کی اور معدہ کی رطوبت پھیپھڑوں میں نہ چلی جائے۔ اس کے رشتہ داروں کو میں نے الگ لے جاکر سمجھا دیا کہ ان کے بچنے کی اُمید نہیں ہے ان کو خدمت کی ضرورت ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد ان کی کروٹ بدلتے رہیں اور خوراک ناک کی نالی کے ذریعے دیتے رہیں۔ دوسرے دن میں راؤنڈ کیلیے گیا تو اس کی حالت بدستور اسی طرح تھی، کچھ

افاقہ نہیں ہوا تھا۔ ایک چھوٹا بچہ اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اور ایک عورت باقی رشتہ دار باہر تھے۔ بچہ بار بار آواز دیتا، دادا ابو! دادا ابو! اٹھیں ناں۔ دیکھو تو میں آیا ہوں، دادی بھی آئی ہوئی ہے۔ ساتھ بیٹھی ہوئی عورت اس کے الفاظ سے روتی جاتی تھی۔ میں نے کہا بڑی اماں صبر کرو، اور اس بچے کو باہر لے جاؤ۔ تو اس نے کہا اس کا یہ پوتا اس کو بہت ہی عزیز تھا، اس کو خود کھلاتا پلاتا بھی تھا اور اس کے ساتھ کھیلتا بھی رہتا تھا۔ اب اس کو باہر کیسے لے جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر تو بیٹھنے دو، اتنی زندگی اس کے ساتھ گزاری اب تو آخری وقت ہے اتنی سختی تو نہ کرو۔ میں ان کو اس حال پر چھوڑ کر آگے دوسرے مریض کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن میرے دماغ میں چھوٹے بچے کے الفاظ آخری دم تک گونجتے رہے۔ راؤنڈ ختم کر کے میں اپنے دفتر میں آگیا۔ کچھ دیر بعد اردلی آیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب اس مریض کو دیکھیں شاید مر گیا ہے۔ میں گیا تو وہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ساتھ بڑی اماں سر چارپائی پر رکھ کر رو رہی تھی۔ اور بچہ حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس کے رشتہ داروں کو میں نے موت کی تصدیق کر دی۔ وہ اسکو چارپائی پر ڈال کر لے گئے، عورت کی رونے کے آواز دور تک سنائی دیتی رہی۔ اس کا ہمسفر ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ ہم ڈاکٹر لوگ روزانہ موت کا سامان دیکھتے ہیں، رونے کی آوازیں سنتے ہیں لیکن غفلت کی وجہ سے دل عبرت نہیں لیتا۔

ہارون الرشید بادشاہ کا ایک بیٹا جس کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی کثرت سے زاہدوں اور بزرگوں کی مجلس میں رہا کرتا تھا۔ اکثر قبرستان چلا جاتا وہاں جا کر کہتا کہ تم لوگ ہم سے پہلے دنیا میں تھے، دنیا کے مالک تھے لیکن اس دنیا نے تمھیں نجات نہ دی حتیٰ کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔ کاش مجھے کسی طرح خبر ہوتی کہ تم پر کیا گزر رہی ہے اور تم سے کیا کیا سوال و جواب ہوئے ہیں اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتا۔

؎ تروعنی الْجَنائِزُ کُلَّ یَوْمٍ
وَ یَحْزُنُنِیْ بُکَاءُ النَّائِحَاتِ

ترجمہ: مجھے جنازے ہر دن ڈراتے ہیں اور مرنے والوں پر رونے والیوں کی آوازیں مجھے غمگین رکھتی ہیں۔

ابو عامر بصری فرماتے ہیں میں آخری وقت میں اس لڑکے کے پاس پہنچا تو دیکھا وہ بے ہوش پڑا ہے۔ آدھی اینٹ کا ٹکڑا سر کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کو سلام کیا اس نے جواب نہ دیا۔ میں نے دوسری مرتبہ سلام کیا تو اس نے آنکھ کھولی اور مجھے پہچان لیا میں نے جلدی سے اس کا سر اینٹ پر سے اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے سر ہٹا لیا اور چند شعر پڑھے جس میں سے دو یہ ہیں۔

یَا صَاحِبِیْ لَا تَغْتَرِرْ بِتَنَعُّمٍ

فَالْعُمْرُ یَنْفَدُوَالنَّعِیْمُ یَزُوْلُ

وَاِذَاحَمَلْتَ اِلَی الْقُبُوْرِ جَنَازَۃً

فَاعْلَمْ بِاَنَّکَ بَعْدَھَا مَحْمُوْلُ

ترجمہ: میرے دوست دنیا کی نعمتوں سے دھوکہ میں نہ پڑ۔ عمر ختم ہوتی جا رہی ہے اور یہ نعمتیں سب ختم جائیں گی۔ جب تو کوئی جنازہ لیکر قبرستان جائے تو یہ سوچتا رہا کر کہ تیرا بھی ایک دن اسی طرح جنازہ اُٹھایا جائے گا۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ابو عامر! جب میری روح نکل جائے تو مجھے نہلا کر میرے اسی کپڑے میں مجھے کفن دے دینا میں نے کہا میرے محبوب اس میں کیا حرج ہے کہ میں تیرے کفن کیلیے نئے کپڑے لے آؤں اس نے جواب دیا کہ نئے کپڑوں کے زندہ لوگ زیادہ مستحق ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ کفن تو بوسیدہ ہو جائیگا۔ آدمی کے ساتھ تو صرف اس کا عمل ہی رہتا ہے اور یہ میری لنگی اور لوٹا قبر کھودنے والے کو مزدوری میں دے دینا اور یہ انگوٹھی اور قرآن شریف ہاروں الرشید تک پہنچا دینا اور اس کا خیال رکھنا کہ خود ان ہی کے ہاتھ میں دینا اور یہ کہہ کر دینا کہ ایک پردیسی لڑکے کی یہ میرے پاس امانت ہے اور وہ آپ سے یہ کہہ گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اسی غفلت اور دھوکہ میں آپ کی موت آ جائے۔ یہ کہہ کر اس کی روح پرواز کر گئی۔

(جاری ہے)

اکابر علمائے دیوبند کی تواضع (اٹھارہویں قسط)

(مفتی فدا محمد صاحب، دارالعلوم جامعہ رحمانیہ مینئی، صوابی)

محدثِ کبیر فقیہ العصر حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ کی تواضع:

پیدائش ۲۷ اگست ۱۸۸۲ء وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۶۵ء

حضرت مولانا کی یہ ایک امتیازی شان تھی کہ بایں جامعیت وکمال اور اس قدر علوم میں مہارت کے باوجود خودنمائی کا مادہ بالکل نہیں تھا۔ خودنمائی تو درکنار شانِ اخفاء ایسی تھی کہ نووارد یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنے بڑے عالم ہیں۔ تواضع ایسی کہ طالبین ووارد ین کے استفسارات کے موقع پر اپنے لیے بغیر تکلف وتصنع کے سوائے ''ناکارہ، نالائق، بیکار'' جیسے الفاظ کے علاوہ اور کوئی لفظ استعمال نہیں فرماتے تھے۔ ہر ادا سے تواضع ٹپکتی تھی، دورانِ گفتگو یا درس دیتے وقت کبھی ایسا لفظ نہیں سنا گیا جس سے رفعت وعلو کی بو آتی ہو۔ تلامذہ ومسترشدین، واقف وناواقف ہر ایک سے تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ اس خودنمائی کے دور میں تھوڑا سا بھی کمال ہو تو کسی نہ کسی وقت اپنے کمال کے اظہار پر مجبور ہو کر خودنمائی کا مظاہرہ ہو ہی جاتا ہے، مگر اپنے اسلاف کا یہی طور طریقہ تھا کہ کمالات کے باوجود اخفاء کی کوشش کی اور خود نمائی سے احتراز کیا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی سے کام لیتے ہیں تو ہزار بار اپنے کو چھپائے، اس کی جھلک اوروں کے سامنے آ ہی جاتی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ چند الفاظ پڑھنے کی تہمت لگ گئی ہے ورنہ اپنے کو ایسا مٹاتا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ قاسم کون ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے اس فطری اخفاء کے پیشِ نظر سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب آپ مناظروں کے لیے تشریف لے جاتے تو سادہ لباس ہوتا، کوئی یہ نہ سمجھتا کہ یہ مولانا قاسم نونتویؒ ہیں، نام پوچھنے پر اپنا تاریخی نام خورشید حسن بتاتے اور سکونت کے استفسار پر وطن کا نام الہ آباد بتاتے کہ ہر جگہ

اللہ تعالیٰ ہی کی آباد کی ہوئی ہے۔حضرت مولانا عبد الرحمٰن کاملپوری صاحب کی بھی یہی شان تھی۔اللہ تعالیٰ نے کمالات سے نوازا تھا لیکن کسرِ نفسی اور اخفاء جیسی صفات سے متصف تھے۔

کیا مجال کہ کسی مجلس میں خود کو نمایاں کیا ہو، بلکہ کئی احباب کے سامنے فرماتے کہ اللہ تعالیٰ مشار بالاصابع (جس کی طرف لوگ انگلی سے اشارہ کریں) یعنی لوگوں کی انگشت نمائی سے بچائے کہ اس میں ہلاکت کا خطرہ ہے۔ایک حدیث میں ایسے مؤمن کی تعریف ان الفاظ میں ارشاد فرمائی گئی ہے

عن ابی امامة عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اغبط اولیائی عندی لمؤمن خفیف الحاذ ذو خظ من الصلوة احسن عبادة ربه و اطاعه فی السر و کان غامضاً فی الناس لا یشار الیه بالاصابع و کان رزقه کفافاً و صبر علیٰ ذالک ثم نقد بیده فقال عجلت منسیته قلت بواکیه قل تراته (مشکوٰۃ ص ۴۴۲)

ترجمہ:’’ میرے دوستوں میں سے زیادہ غبطہ کے قابل میرے نزدیک وہ مؤمن ہے جس کا مال کم ہو، نماز کا بڑا حصہ اس کو حاصل ہو، اپنے رب کی عبادت بڑے اچھے طریقے سے ادا کرے اور اپنے ربّ کی اطاعت خفیہ طریقہ سے کرے، لوگوں میں مشہور نہ ہو، انگلیوں سے اس کی طرف اشارہ نہ کیا جائے، رزق اس کا بقدر کفایت ہو اور اس پر صابر رہے۔‘‘

اس حدیث میں مشار بالاصابع ہونے سے بچنا اولیاء اللہ کی ایک نشانی فرمایا گیا ہے ۔اس دور میں اس کی بڑی کمی ہے، خودنمائی کا مظاہرہ کرنے والوں کو اولیاء سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنی محبت وولایت جیسی حقیقی دولت سے نوازتے ہیں وہ خودنمائی اور خودستائی جیسی چیزوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔مولانا اسعد اللہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ آپ عالمانہ علوم کے باوجود تکلف وتصنع سے دور اور نام ونمود سے نفور تھے۔مولانا یوسف صاحب بنوریؒ فرماتے

ہیں علم وفضل اور شرافت وکمال کے ساتھ انکسار وتواضع ،خاموشی وکم گوئی مولانا کی ایک فطری کرامت تھی ۔مولانا سید محمد ازہر شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں حضرت مولانا سطحی اور خودفروش انسانوں کی طرح اپنے کمالات کی تجارت نہیں کیا کرتے تھے ،اور نہ معرفت الٰہی ،یقینِ کامل اور نورِ باطن کی جو دولت انہیں ملی تھی اس کی وہ شہرت پسند فرماتے تھے۔غرض یہ کہ اس طبقہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا جو

ے کسی کی زلف پریشاں ،کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشا بنائے پھرتے ہیں

مولانا عبدالشکور صاحب تحریر فرماتے ہیں: حضرت مولانا کا تبحر علمی اور ہرفن میں یک فنی کا مصداق ہونا اظہر من الشمس ہے ۔باوجود اس کے حضرت مرحوم کی زبان سے کسی طرح یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ حضرت اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں ،یا بڑے بڑے لوگ ان کے شاگرد ہیں اس کا اظہار پسند نہ فرماتے تھے ۔حضرت مرحوم تفاخر وریاکاری اور شہرت سے بہت دور بھاگتے تھے اور گمنامی کی زندگی بسر کرنا پسند تھی ۔

مولانا ظہور الحسن صاحب تحریر فرماتے ہیں استاد حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی مثال ''صدف حامل درشہوار'' کی سی تھی جو اپنے شکم میں درِیتیم کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے کہ عام نظر اس کے چھپے ہوئے بیش قیمت دریکتا سے تو نا آشنا ہوتی ہے اور محض خاموش اور سادہ صدف سامنے ہوتی ہے جو اپنے جوہر تک سطحی نظروں کو پہنچنے سے روکتی ہے ۔حضرت مولانا باوجود یہ کہ علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر اور ساتھ ہی علوم باطنی اور نسبت باطنیہ سے سرفراز تھے لیکن آپ کی خاموش زندگی اور متواضع طبیعت ان کمالات کو چھپائے ہوئے تھی ۔علمی مباحث کی مجلسوں حتی کہ درس میں بحثوں کی گرما گرمی کے موقعوں پر آپ ایسے غیر ملتفت اور خاموش نظر آتے کہ ناواقف دھوکہ کھا جاتا کہ شاید مولانا زیر بحث مسئلہ کی گہرائی کے متعلق کچھ واقفیت نہیں رکھتے ۔سلسلۂ گفتگو

میں کج بحثی یا گرے ہوئے نا معقول قسم کے دعوے بھی آ جایا کرتے ہیں جو معمولی اہل علم کے نزدیک بھی قابل اعتراض ہوتے ہیں لیکن مولانا کی زبان سے تو کیا قیافہ سے بھی معلوم نہ ہوسکتا کہ آپ بھی کچھ روشنی ڈالیں گے۔ درس میں کسی قول کی ترجیح کے بیان میں انانیت، انفرادیت اور ذاتی رائے کے شائبہ تک سے احتراز فرماتے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب تحریر فرماتے ہیں: حضرت مولانا بہت زیادہ متواضع اور منکسر المزاج اور خوش اخلاق تھے۔ مسترشدین کے جھرمٹ میں کھری چارپائی پر بیٹھ جاتے، سادہ مگر صاف کپڑے زیب تن فرماتے، کسی بھی نشست و برخاست میں خود پسندی یا غرورِ علمی کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ چھوٹے بڑے سے لطف و مہربانی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور وجہ طلیق کے ساتھ منبسط (مسکرانا) ہوکر ہمکلام ہوتے۔ مکان سے جب مدرسہ تشریف لاتے تو بعض طلباء دارالطلبہ کے گیٹ کے بینچ پر بیٹھے ہوئے آپ کو دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو جاتے، آپ کو یہ ناگوار گزرتا تھا۔ ترمذی شریف کے سبق میں جب قیام تعظیمی کی بحث آئی تو طلبہ کو سخت تنبیہ فرمائی اور بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ میرے لیے کبھی کوئی نہ اٹھا کرے۔ حضرت مولانا اپنا کام خود کرنے کی کوشش فرماتے تھے، دوسرے سے خدمت لینا گوارا نہ ہوتا تھا۔ ہاں اگر کوئی خاص خادم اور بے تکلف ہوتا تو خدمت منظور فرمالیتے۔ حضرت مولانا کی طبعی تواضع میں تصنع و تکلف نہ تھا اس لیے علو منصب کبھی اس طبعی و فطری تواضع میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ جس وقت حضرت مولانا مظاہر العلوم کے عہدۂ صدارت پر فائز تھے اس وقت کے دو سبق آموز واقعات مولانا محمود رنگونی تحریر فرماتے ہیں جس میں طلبہ و علماء کے لیے درس و موعظت کا سبق پنہاں ہے۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ عید الاضحیٰ کے موقع پر حسب معمول حضرت اقدس استاذ الاساتذہ مولانا سید عبد اللطیف صاحب قدس سرہ ناظم اعلیٰ جامعہ مظاہر العلوم سہارنپوری قربانی کے انتظام میں مشغول تھے، ایک ضرورت کی بنا پر مجھے حضرت اقدس ناظم صاحب قدس سرہ کی

خدمت میں حاضر ہونا تھا۔ دارالطلبہ پہنچا معلوم ہوا کہ حضرت اقدس ناظم صاحب حضرت الاستاذ قدس سرہ کے حجرہ میں تشریف فرما ہیں ۔ میں حضرت قدس سرہ کے حجرہ میں داخل ہوا، میری آنکھوں نے یہ دیکھا کہ حضرت ناظم صاحب تھکے ہوئے لیٹے ہیں اور حضرت الاستاذ قدس سرہ بلا تکلف حضرت ناظم صاحب کے پاؤں دبا رہے ہیں ۔ اللہ اللہ، جامعہ کے صدر مدرس ہونے کے باوجود اور پھر دارالطلبہ میں کثیر تعداد شاگردوں وطلبہ کے ہوتے ہوئے حضرت الاستاذ قدس سرہ نے اپنے استاذ محترم حضرت ناظم صاحب کے پاؤں دبانے میں ہی اپنی سعادت سمجھی ۔ جب میں حجرہ میں داخل ہوا تو یہ خیال ہوا کہ اب حضرت اس خدمت سے رک جائیں گے مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت الاستاذ جامعہ کے صدر مدرس نہیں ہیں بلکہ ہماری طرح ایک طالبعلم ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت الاستاذ قدس سرہٗ نے جامعہ دارالعلوم دیوبند میں بھی دورہ حدیث کا درس لیا تھا۔ حضرت رأس المحدثین علامہ شیخ الہند قدس سرہٗ سے بخاری شریف کا درس حاصل فرمایا۔ اسی زمانہ میں حضرت الاستاذ نے حضرت عارف باللہ مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب دیوبندی قدس سرہٗ سے بھی ابوداؤد شریف پڑھی تھی، میری طالبعلمی کے زمانہ میں جب حضرت اقدس میاں صاحب مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر سہارنپور تشریف لاتے تو بعض مرتبہ غریب خانہ پر قیام فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت الاستاذ قدس سرہٗ نے مجھ سے فرمایا کہ شیخ ! حضرت میاں صاحب تمہارے مکان میں قیام فرمایا کرتے ہیں، کبھی موقع ہو اور حضرت تشریف لائیں تو مجھے اطلاع دینا ! میں تنہائی میں حضرت کے پاس کچھ دیر کے لیے حاضر رہنا چاہتا ہوں ۔ چنانچہ ایک مرتبہ سخت گرمی کا موسم تھا، حضرت اقدس میاں صاحب قدس سرہٗ سہارنپور تشریف لائے اور میرے یہاں قیام فرمایا۔ میں نے حسب حکم حضرت الاستاذ کو اطلاع کردی، دوپہر کا وقت تنہائی کا تھا اس کی بھی خبر کردی ۔ حضرت بہت خوش ہوئے اور چلچلاتی

دھوپ میں سر پر رومال ڈالے غریب خانہ پر پہنچے اور جس کمرے میں حضرت میاں صاحب آرام فرما رہے تھے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے باہر سے دروازہ بھیڑ دیا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ شروع میں کیا باتیں ہوئیں البتہ میں نے کچھ دیر کے بعد آہستہ سے دروازہ کو تھوڑا سا کھولا اور یہ دیکھا کہ حضرت اقدس میاں صاحب قدس سرہٗ چارپائی پر استراحت فرما رہے ہیں اور حضرت الاستاذ صدر مدرس مظاہر العلوم پاؤں دبا رہے ہیں، تقریباً گھنٹہ بھر پاؤں دباتے رہے۔

بعد میں میں نے حضرت استاذ قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ: حضرت آپ نے یہ تکلیف کیوں فرمائی؟ ہم خدّام خدمت کے لیے کافی ہیں۔ فرمانے لگے شیخ! میاں صاحب میرے استاذ ہیں، میں اس خدمت سے محرومی کو کیسے گوارا کرسکتا ہوں، ان حضرات اساتذہ ہی کی برکت سے لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ یہ دونوں واقعات حضرت الاستاذ قدس سرہ' کے کمالات میں زرّیں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

(جاری ہے)

(صفحہ ۲۲ سے آگے) اوپر سے ان کے ساتھیوں نے پھر ان کو کوشش کرنے سے روکا۔ ان دو مینڈکوں میں سے ایک نے کوشش ترک کردی۔ جبکہ دوسرا مینڈک مسلسل چھلانگیں لگاتا رہا۔ اوپر سے ساتھیوں نے اور زور وشور سے اس کو منع کیا کہ تم ہرگز اوپر نہیں آسکتے۔ مینڈک نے ان کی باتوں پر کان نہیں دھرا اور کوشش میں لگا رہا۔ اور آخر ایک اونچی چھلانگ لگا کر کھڈے کے کنارے پر پہنچ گیا اور باہر آ گیا۔ باقی مینڈک حیرانی سے پوچھنے لگے کہ تم ہمارے روکنے سے کیوں نہیں رُکے۔ تو مینڈک نے جواب دیا کہ ''اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے میں بہرا بن گیا تھا۔'' یعنی اپنے مقصد کے حصول کے لئے پوری تندہی سے کوشش کرنی چاہئے اور لوگوں کی منفی اور دل شکن باتوں پر توجہ نہیں دینی چاہئے۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کیلئے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم۰

یَا مُصَوِّرُ یَا مُصَوِّرُ یَا مُصَوِّرُ وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ۰ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً
فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ۰ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً
فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ق ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ
اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ۰ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ۰ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ
خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ۰ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ط اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ط یَهَبُ
لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنٰثًا وَّ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّکُوۡرَا ط اِلٰهِی بِحُرۡمَتِ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ
عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَ اَهۡلِ
بَیۡتِ الۡعِظَّام.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم۰

یَا مُصَوِّرُ یَا مُصَوِّرُ یَا مُصَوِّرُ وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ۰ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً
فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ۰ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً
فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ق ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ
اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ۰ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ۰ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ
خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ۰ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ط اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ط یَهَبُ
لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنٰثًا وَّ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّکُوۡرَا ط اِلٰهِی بِحُرۡمَتِ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ
عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَ اَهۡلِ
بَیۡتِ الۡعِظَّام.